ولی کا سایہ

مائل خیرآبادی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ولی کا سایہ

۱۵ر اگست کی تاریخ تھی۔ ہمارے کالج میں آزادی کا دن بڑے جوش اور دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ پرنسپل صاحب نے دوسرے پروگراموں کے ساتھ ایک جلسہ بھی کیا تھا۔ اس جلسے میں مجھے تقریر کرنا تھی۔ میں نے اپنی تقریر سوچ کر اچھی طرح تیار کر لی تھی۔ اُسے لکھ لیا تھا۔ ماسٹر صاحب کو دکھا کر اصلاح بھی لے لی تھی اور اُسے زبانی یاد بھی کر لیا تھا۔ میری تقریر کی اصل بات یہ تھی کہ ہم انگریز کی غلامی سے تو آزاد ہو گئے لیکن جب تک غریبی سے چھٹکارا نہ پا سکیں گے اس وقت تک سچ مچ آزاد نہیں کہے جا سکتے۔ اس کے لیے ہمیں غریبوں کو سہارا دینا ہوگا۔ انہیں مدد دے کر اپنے برابر لانا ہوگا۔ تبھی ہم کامیاب ہو سکیں گے۔

میں ۱۵ر اگست کی صبح کو بہت خوش تھا۔ میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر بار بار تقریر کی مشق کرلی تھی۔ مجھے امید تھی کہ آج سب سے بڑا انعامی تمغہ میں حاصل کروں گا میں نے صبح ہی صبح غسل کیا۔ پھر یہ سوچ رہا تھا کہ آج کون سا سوٹ پہن کر جلسے میں جاؤں۔ میں نے اپنا بہترین سوٹ نکالا ابھی پہنا نہیں تھا کہ کریمن دوڑتی ہوئی میرے کمرے میں آئی وہ بہت ہی بدحواس اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا :۔

" شوکت میاں ! تمہارے پاس بائیسکل ہے۔ دوڑ کر شہر سے دوا لادو، شبراتی لب دم ہے "

اس وقت کریمن کا آنا مجھے بہت برا لگا۔ میں اپنے ٹھاٹ کی دھن میں تھا، میں نے اُسے جھڑک دیا۔

"مجھے فرصت نہیں، کسی اور سے منگالو"

" بیٹیا ! ابھی تو تمہارے کالج کا بہت وقت ہے، دوبارہ شہر جاکر آجاؤگے ...."

کریمن کچھ اور کہنے والی تھی لیکن میں نے اُسے دھکے دے کر کمرے سے باہر نکال دیا۔

"ہونہہ، میں اس کا نوکر ہوں۔ چلی ہے بڑی حکم جتانے والی، میں آج اپنی تقریر کے بارے میں سوچوں یا دوا لینے جاؤں۔ بھاگم بھاگ میں تھک جانے سے کیا تقریر کرسکوں گا۔"

میں نے اپنا بہترین سوٹ پہن لیا۔ اُس دن امّی جان نے انڈوں کا حلوا، بُھنا ہوا پیازی قیمہ پراٹھے تیار کرائے تھے، میں نے کھایا، چائے پی، گھڑی دیکھی، نو بجنے والے تھے، میں کھا پی کر اپنی بائیسکل کے پاس آیا۔ اس کے پہیوں کی ہوا دیکھی، وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ میں نے جیب سے ایک بار پھر اپنی لکھی ہوئی تقریر نکالی۔ اس پر ایک نظر ڈالی اور بائیسکل لے کر کالج کی طرف چل دیا۔ میں تقریر کو رٹتا ہوا خوش خوش جا رہا تھا۔

شہر میرے گاؤں سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ پکی سڑک تو نہیں لیکن راستہ پھر بھی اچھا ہے۔ برسات میں کیچڑ تو ضرور ہو جاتی ہے مگر کنارے کنارے راستہ اچّھا ہے۔

میں کنارے کنارے ہی جا رہا تھا، اچانک بادلوں کی گھڑ گھڑاہٹ سُنی، میں اپنی تقریر کی دُھن میں قریب قریب آدھا راستہ طے کر چکا تھا لیکن میرا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ ہوا تیز ہو رہی ہے اور بادل گھر آئے ہیں۔ بادلوں کی گرج سُنی تو میں نے

آسمان کی طرف دیکھا۔ میں نے سائیکل تیز کردی۔ سامنے دیکھا محمود بھاگم بھاگ شہر کی طرف جارہا تھا۔ میں دو منٹ میں اس کے پاس پہنچا۔ اب پانی برسنے لگا تھا۔

محمود کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے سلام کیا۔ "شوکت میاں، شوکت میاں! پیچھے بٹھالو مجھے، شبراتی کے لیے دوا لانا ہے۔ کچھ پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔"

"ہونھ، یہ خوب رہی، میں خود ہی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ نہ جانے کیسے کالج پہنچ سکوں گا، میرا سوٹ لت پت ہوجائے گا۔"

میں نے "ہونھ" کرکے سائیکل کو اور تیز چلانے کے لیے بھرپور پیرا مارا۔ اچانک چین اترگئی، میں نے اترکر چین چڑھائی اور پھر چلا تو دو چار ہی قدم پر فری وھیل فیل ہوگئی اب مصیبت ہوئی، میری زبان سے نکلا اور میں پریشان ہونے لگا اب پیدل چلنا اور ساتھ ہی بائیسکل کو لے چلنا میرے لیے جان کا جنجال ہوگیا۔ سب سے زیادہ افسوس مجھے سوٹ کا تھا۔ جو خراب ہورہا تھا۔ محمود تیز تیز پیچھے آرہا تھا۔ وہ میرے برابر آگیا "کیا ہوا شوکت میاں؟" میں نے کھسیانا ہوکر کہا "فری وھیل

فیل ہوگئی ہے" محمود نے میری پریشانی سمجھ لی۔ کہنے لگا " شوکت میاں! بائیسکل مجھے دیدو۔ میں اُسے لے کر آتا ہوں۔ تم جلدی آگے بڑھو تمہارے کالج کا ٹائم جارہا ہے۔ سُنا ہے آج تقریر کرنے والے ہو۔"

"ہاں محمود! مگر اب بہت پریشان ہوں۔ میرا سوٹ ستیاناس ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا، اب واپس جاؤں یا کیا کروں؟"

" واپس جاکر کیا کروگے، میں شبراتی کی دوا لے کر ابھی واپس جاؤں گا۔ تمہاری سائیکل مرمت کے لیے دے دوں گا۔ جب تک میں دوا لوں گا، مرمت ہو جائے گی پھر میں اسی سے جھٹ گاؤں پہنچ جاؤں گا اور تمہارا دوسرا سوٹ لاکر دے دوں گا۔ یہ لو تم میری چادر لے لو، اسے باندھ کر سوٹ سکھانے کے لیے ڈال دینا۔ میں ابھی گیا اور آیا۔"

"اچھا تو تم میرا دوسرا سوٹ لادوگے؟

"کیوں نہیں، اپنے بھائی کی مدد کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔"

"شاباش محمود!" میں نے اُسے شاباشی دی اور پانچ روپیہ کا نوٹ اس کے آگے بڑھا دیا۔

" یہ کیا ہوگا شوکت میاں؟"

"کچھ بائیسکل کی مرمت کے لیے دے دینا، باقی تم لے لینا۔"

"میں کس بات کے لیے لوں؟"

"یہ تمہارے اس احسان کا بدلہ ہے جو آج تم میرے ساتھ کروگے۔"

بدلہ میں اللہ سے لوں گا۔ مزدوری تم کسی اور کو دینا" محمود نے تیکھے پن سے کہا اور صرف ایک روپیہ لے کر چل دیا۔ وہ بائیسکل لے کر بھی مجھ سے تیز چل رہا تھا۔ حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ نہ تو تگڑا تھا اور نہ طاقتور، وُہ مجھ سے عمر میں بھی چھوٹا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میری عادت پیدل چلنے کی نہ تھی۔ وہ بھی میرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہ تھا مگر اس وقت اس نے مجھ پر جو احسان کیا اس سے ذرا میرا دل اس کی طرف کھنچا لیکن پھر میں نے کہا "ہونھ، میں گاؤں کے رئیس کا لڑکا۔ محمود کا باپ کسان آدمی۔ کسان پھر کسان، میں بڑا آدمی۔ ان چھوٹوں کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ہمارا کام کریں۔ ابّا جان تو اس طرح کی بیگار لیا ہی کرتے ہیں۔

میں یہی سوچتا ہوا محمود کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میں اس کی دی ہوئی چادر اوڑھے تھا۔ اچانک ایک طرف دیکھا ایک آدمی، بوڑھا اور کمزور آدمی، جو آگے جا رہا تھا، لڑکھڑا کر

ایک گڑھے میں جا گرا۔ محمود مجھ سے آگے تھا وہ بائیسکل ایک پیڑ کی جڑ کے پاس رکھ کر جھپٹا۔ گڑھے سے بڈھے کو نکالنے لگا مگر بڈھا اس سے نکل نہیں رہا تھا۔ میں پاس پہنچا تو نہ جانے کیوں ہنس پڑا۔ آگے بڑھنے کو تھا کہ محمود نے کہا "شوکت میاں! ذرا سہارا دے دو تو میں اس غریب کو نکال لوں!"

"یعنی میں تمہاری طرح گڑھے میں اُتروں۔ شجاعت علی خاں کا بیٹا اب پاسی چماروں کو گڑھے سے نکالے"

تو کیا ہوا، شوکت میاں! انسان، انسان ہی کے کام آتا ہے یہ تو بڑے ثواب کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ خوش ہوگا۔ اور دیکھو شوکت میاں! بڑائی تمہارے اس بہترین سوٹ میں نہیں ہے اور نہ تمہارے چونے اور اینٹ کے بنے ہوئے محل میں ہے اور نہ اس میں ہے کہ تم شجاعت علی خاں کے بیٹے ہو۔ بڑائی اس میں ہے کہ تم اللہ کے بندوں سے کتنی ہمدردی رکھتے ہو۔ شوکت میاں تم نے پڑھا ہوگا۔

شعر:۔ دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

میں نے اب بھی سُنی ان سنی کر دی۔ آگے بڑھ گیا۔ محمود

نے جو یہ شعر سُنایا تو مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے اُسے یاد کرلیا۔ دل میں سوچا کہ اپنی تقریر میں کسی نہ کسی جگہ اُسے ضرور پڑھوں گا۔ پھڑک اٹھیں گے سُننے والے۔

میں آگے بڑھ گیا۔ اب کالج کی عمارت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کالج بس یہی پانچ چھ کھیت دور تھا۔ اب پانی موسلا دھار برس رہا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے قدم آگے بڑھانا مشکل تھا۔ میں نے اپنے گاؤں کے لنگڑے اہیرے کو دیکھا۔ وہ دودھ لیے جا رہا تھا۔ اچانک اس کا پیر پھسلا اور دھڑام سے گرا، دودھ کا ڈبہ اس کے ٹخنے پر آپڑا اور اسے سخت چوٹ آئی۔ وہ چوٹ کھا کر چیخا "ہائے رام" "میں دردِ دل" والا شعر پڑھتا جا رہا تھا۔ مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ محمود نے بڈھے کو کسی نہ کسی طرح نکال لیا تھا اور اُسے میری بائیسکل پر بٹھائے آرہا تھا۔ اب لنگڑے اہیر کی چیخ سُن کر نہ جانے کیا ہوا کہ میں اپنا کوٹ پتلون بھولا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں شجاعت علی خاں کا لڑکا ہوں۔ میں جھٹ بڑھا۔ اہیر کے پاس پہنچا۔ وہ اب اٹھ کر نہیں چل سکتا تھا۔ "ہائے رام" "ہائے رام" چیخ رہا تھا۔ اس وقت نہ جانے کون سی قوت مجھے اس کی

مدد کے لیے ابھار رہی تھی۔ آخر میں نے اہیر کو اُٹھا کر پیٹھ پر لاد لیا۔ اس کا ڈبّہ اٹھا لیا اور اسی طرح لشتم پشتم آگے بڑھا۔ نہ جانے اب طاقت میرے جسم میں کہاں سے آگئی تھی۔

دو تین کھیت اور گیا تھا کہ بارش بند ہوگئی اور بادل چھٹنا شروع ہوگئے۔ میں نے دیکھا، پرنسپل محمد احمد خاں صاحب کالج کی چھت پر کھڑے بارش کا نظارہ کر رہے تھے انہوں نے مجھے دیکھا۔ ان کے ساتھ کچھ ٹیچر اور لڑکے بھی کھڑے تھے۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کیا اور ان سب سے کچھ کہا۔ میں نے دیکھا کہ کالج میں لڑکے اور ٹیچر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ پھر کچھ میری طرف دوڑتے ہوئے آئے۔ سب سے پہلے بشیر اور پرکاش میرے پاس پہنچے۔ پرکاش نے کہا "ارے یار! تم دیوتا کب سے ہوگئے؟ بشیر نے کہا "یار تم پورے ولی نکلے۔ ابھی ابھی پرنسپل صاحب نے تم کو دیکھ لیا ہے۔"

"میں ولی تو نہیں۔" میں نے بشیر سے کہا اور لنگڑے اہیر کو پیٹھ پر ذرا اور سنبھال لیا۔

"اچھا ولی نہیں تو اس وقت تم پر کسی ولی کا سایہ ضرور پڑ گیا۔" بشیر نے کہا، اور اس نے میرے ہاتھ سے دودھ کا

ڈبیّہ لے لیا۔

"ہاں، یہ ہوسکتا ہے، اس وقت ایک ولی ہی کا سایہ ہے۔" میں نے کہا، اور پرکاش کے کہنے پر لنگڑے اہیر کو اس کے حوالے کر دیا۔ پرکاش نے مجھ سے کہا۔ تم کو پرنسپل صاحب نے اپنے کمرے میں بُلایا ہے۔

"مگر بھائی! وہ ولی کہاں ہے جس کا سایہ اس وقت تم پر پڑا ہے؟" بشیر نے پوچھا۔ "وہ پیچھے آرہا ہے!" میں نے پیچھے مڑ کر محمود کی طرف اشارہ کیا۔

نورا کی نصیحت

دیو کی دیو ڈیل ڈول، لال انگور چہرہ، آنکھوں میں لال لال ڈورے، موٹے موٹے گال اور دونوں گالوں پر کانوں تک گلہری کی دم کی طرح پھولی پھولی سفید گل مونچھیں، چھوٹی مگر موٹی گردن، چوڑا چکلا سینہ۔ بھرے بھرے بازو۔ پانچ پانچ انگل چوڑی دونوں کلائیاں۔ دونوں رانیں جیسے کیلے کے تنے۔ قد پورے چھ فیٹ کا۔ گوشت پوشت سے بھرپور۔ تہمد باندھے۔ کرتہ پہنے اور سر سے لال رومال لپیٹے ہوئے۔ اس نے اپنا نام "نورا" بتایا، اور عمر بتائی ستّر سال۔

"ستّر سال؟" ابّاجان کی زبان سے نکلا اور وہ نورا کو تکنے لگے۔ "کیا تم پہلوانی کرتے تھے۔"

"نہیں حضور! میں غریب آدمی۔ کیا کھا کے پہلوانی کرتا۔"

"تو کیا تم گاما کی اولاد ہو؟"

"سرکار، گاما کی اولاد ہوتا تو کاہے کو چوکیداری کے لیے دَر دَر کی خاک چھانتا!
تو پھر اس عمر میں تمہارا یہ توانا اور تگڑا جسم کیوں ہے۔ کیا کھاتے پیتے ہو؟"

ابّا جان کے اس سوال پر نورا کچھ جھینپ سا گیا۔ پھر سر جھکا کر بولا۔ "حضور! آپ جیسے بڑے لوگوں کی چوکیداری کرتے عمر گذری۔ کھاتے پیتے گھرانوں سے جو مل گیا، اللہ کا نام لے کر کھا پی لیا۔"

"اکیلے ہو یا تمہارے گھر کوئی اور بھی ہے؟"

"گھر ہی نہیں سرکار تو کوئی اور کہاں سے ہو؟"

"تو رہتے کہاں رہے؟"

"حضور! آپ جیسے رئیسوں کے گھر آنکھ کھلی۔ بڑوں کے آگے کا بچا ہوا کھانا کھانے میں وہ مزہ آیا کہ بس کچھ نہ پوچھیے سرکار! جس کے یہاں رہا اسی کے گھر کو اپنا گھر سمجھا۔ اسی کے بچّوں کو اپنا بچّہ سمجھا اور پھر اسی طرح یہ عمر آگئی۔ نہ کسی نے شادی کے لیے پوچھا اور نہ میں نے اس کے لیے کسی سے کہا۔"

"اچھا تو ہمارے یہاں تم کو کھانا کپڑا اور بیس روپیہ ملے گا۔"

"بہت ہے سرکار!"

"اچھا تو دیکھو نورا! ڈیوڑھی کی بغل میں وہ جو کوٹھری ہے اس میں تم رہو گے۔ وہ دیکھو غسل خانہ ہے۔ جاؤ نہا دھو لو۔ اور دیکھو سعید میاں (ابّا جان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا) نورا کے لیے کھانا لے آؤ۔"

اس بات چیت کے بعد نورا ہمارے یہاں رہ پڑا۔ میں نے جا کر امّی جان سے نورا کے بارے میں بتایا۔ پھر کھانا لیا اور نورا کی کوٹھری کھول کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور وہیں بیٹھ کر یہ سوچنے لگا کہ دیکھو اس نئے چوکیدار سے کس طرح نبھتی ہے۔"

میں یہ سوچ ہی رہا تھا، اتنے میں نورا آ گیا۔ ایک نظر اُس نے کوٹھری پر ڈالی۔ پھر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس پر بیٹھے بیٹھے کھانا کھانے لگا اور میں اس کا چہرہ مہرہ تکنے میں لگ گیا۔ کھاتے کھاتے اس نے ایک بار مجھے دیکھا تو مسکرایا پھر بولا:

"کیا دیکھتے ہو سعید میاں؟"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تو ابّا جان سے بہت بڑے ہو — ہے نا! یہ بات؟"

"ہاں میاں! دونی عمر تو ہو گی میری!"

"تو پھر میں —

نورا میری طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے سچ مچ میں اس کا پوتا ہوں۔ محبت کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ کھانا کھا کر بولا:
لو بیٹا، لے جاؤ۔"

جب میں ٹرے اٹھانے لگا تو نورا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا پھر ٹرے لے کر کوٹھری سے جانے لگا۔ نورا مجھے دیکھنے لگا۔

(۲)

چار بجے جب میں اسکول سے آیا تو امّی جان نے مجھے دو کیلے دیے۔ کیلے لیے ہوئے میں نورا کے پاس چلا گیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا تھا۔ میں نے ایک کیلا اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیسا سعید میاں!"

"امّی جان نے مجھے دو کیلے دیے۔ میں نے سوچا ایک نورا بابا کو دیدوں۔ لو نورا بابا! ایک تم کھاؤ ایک میں۔"

"کیسے اچھے ہو تم سعید میاں! لیکن تم ہی کھا لو۔"

"نہیں نورا بابا! ایک کیلا تم کو کھانا ہوگا۔ ہم تو غفورا کو بھی دیتے تھے۔ نہ جانے کیوں ابّا جان نے اُسے برخاست کردیا۔ بڑا اچھا

چوکیدار تھا وہ، اور میرا بڑا خیال رکھتا تھا! سمجھے تو نورا بابا!"

نورا میری طرف دیکھنے لگا اور دیکھتا رہ گیا۔ جیسے اس کے سامنے کوئی انوکھی چیز آگئی جسے وہ بڑے تعجب کے ساتھ تک رہا تھا۔

"لو نورا بابا! کیلا کھاؤ۔" میں نے پھر کہا۔

"نہیں، تم ہی کھاؤ۔" سعید میاں! اللہ نے چاہا تو میں بھی تمہارا بہت خیال رکھوں گا۔"

نورا نے کیلا نہیں لیا۔ دونوں کیلے میں نے کھائے۔ پھر میں نے کہا: "بابا! آج امی جان حلوہ بنا رہی ہیں۔ میں تمہارے لیے ڈھیر سا لاؤں گا۔"

نورا کچھ نہ بولا۔ میں اس کے پاس سے اُٹھ کر چلا آیا۔ وہ مجھے برابر دیکھ رہا تھا۔ شام کو جب امّی جان نے نورا کا کھانا مجھے دیا تو اس کے لیے حلوہ بھی رکھ دیا۔ میں نے امّی جان کی آنکھ بچا کر تھوڑا حلوہ اور رکھ لیا اور خوشی خوشی نورا کے پاس لے گیا۔ نورا نے حلوہ دیکھا میرا خیال تھا کہ وہ بہت خوش ہو جائے گا لیکن اس نے پوچھا۔

"سعید میاں! یہ حلوے پر حلوہ کیسا رکھا ہے؟"

"نورا بابا! حلوے کی پلیٹ چھوٹی ہے نا! تو امّی نے دوبارہ رکھا اس لیے الگ الگ معلوم ہوتا ہے۔" یہ کہنے کے ساتھ مجھے اپنی

غلطی محسوس ہوئی کہ حلوہ چُرا کر جلدی میں رکھ لیا اور ٹھیک ٹھاک نہیں کیا۔ اب مجھے بات بنانا پڑی۔ نورا نے کہا۔

"سعید میاں! تم بڑے اچھے بچے ہو، اچھے بچے نہ تو جھوٹ بولتے ہیں اور نہ چوری کرتے ہیں۔" نورا کھاتا رہا اور اچھے بچوں کی اچھی باتوں کو بیان کرتا رہا۔ جب وہ کھانا کھا چکا اور اس نے کہا "سعید میاں لے جاؤ ٹرے!" تو میں نے دیکھا کہ حلوہ ویسے کا ویسا ہی رکھا ہے، اس میں سے ایک چمچہ بھی نورا نے نہیں کھایا۔ اب میں پریشان ہونے لگا۔ امی جان اتنا زیادہ دیکھیں گی تو کیا کہیں گی؟ یہ سوچ کر میں نے نورا سے حلوہ کھانے کے لیے کہا لیکن اس نے زکام کا بہانہ کیا۔ اور میرے بار بار کہنے پر بھی نہ کھایا۔ میری بات بگڑی جا رہی تھی۔ میری چوری کھلنے والی تھی۔ میں سوچنے لگا، چوری کیسے چھپاؤں۔ میں سوچتا جا رہا تھا اور ٹرے واپس لیے جا رہا تھا۔ کوٹھری سے نکل کر "میاؤں میاؤں" کی آواز میرے کانوں میں پڑی میں خوش ہو گیا۔ حلوے کی پلیٹ اس کے آگے الٹ دی۔

"یہ حلوہ کیوں پھینک دیا؟" پیچھے سے ڈانٹ پڑی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ بھائی جان ڈیوڑھی سے صحن میں آ چکے تھے۔ ان کی یہ ڈانٹ کیا تھی، جیسے میرے دل میں گھونسہ لگا ہو۔

"ارے .... او .... او .... اے اے گر گیا بھائی جان!
میں گھبراہٹ میں ہکلانے لگا۔ بھائی جان نے حکم دیا۔
"اٹھاؤ اسے!" مجھے اٹھانا پڑا، پھر بھائی جان جب مجھے امی جان کے پاس لائے تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ میری کیا حالت تھی۔ چور جیسے موقع پر دھر لیا گیا ہو۔ وہی حالت میری تھی۔ امّی جان کے اس سوال پر میری تو جان ہی نکل گئی کہ حلوہ تو کم بھیجا تھا، یہ زیادہ واپس آیا!"

پیارے ساتھیو! جو میری یہ کہانی پڑھ رہے ہو، سچ کہنا۔ اگر میری جگہ اس وقت تم ہوتے تو تمہاری کیا گت ہوتی۔ بس سمجھ لیجیے وہی حال میرا تھا۔ جب میں کچھ جواب نہ دے سکا تو امّی جان نے حلوے کا برتن دیکھا۔ "ایں! اس میں انگلیوں کے نشان کیسے؟" اور پھر سب کی سمجھ میں آگیا کہ چوری کس نے کی؛ اور پھر چوری کا "انعام" جو ملنا چاہیے، مجھے ملا مگر یہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ نورا کے لیے میں نے یہ چوری کیوں کی؟

(۳)

نورا ہمارے یہاں جمعہ کو آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جلد سے جلد اُسے رام کر لینا چاہیے۔ جتنی جلد اس سے دوستی ہو جائے گی

اتنی ہی جلد سینما جانے کا موقع مل جائے گا۔ جمعہ کے دن میں نے کیلا اور حلوہ رشوت کے طور پر پیش کیا کہ وہ خوش ہوجائے گا اور پھر اپنا مطلب حاصل کرنے کی کچھ راہ نکل آئے گی مگر میرا داؤں خالی گیا۔ سنیچر کی صبح اور شام دونوں وقت پھر میں نے کئی جتن کیے لیکن نورا میرے داؤں پر نہ آیا۔ اتوار کو میری چھٹی تھی۔ میں صبح ناشتہ کرکے نورا کی کوٹھری کے بغلی برآمدے میں ہوم ورک کرنے بیٹھ گیا۔ میں اسکول کا دیا ہوا کام بھی کرتا جا رہا تھا اور یہ تدبیر بھی سوچتا جا رہا تھا کہ کس طرح نورا سے دوستی گانٹھی جائے کہ وہ میری بات مان سکے اور عشاء کے بعد جب گھر کے سارے لوگ سوجایا کریں تو وہ میرے ساتھ چل کر مزے سے خود سینما دیکھے اور مجھے بھی دیکھنا نصیب ہو۔ غفورا کو تو میں نے ایک ہی دن میں دوست بنا لیا تھا پھر کیا تھا۔ وہ عشاء کے بعد میرا راستہ دیکھتا رہتا جب سب سوجاتے تو اس کی کوٹھری کا دروازہ جو بغلی برآمدے کی طرف ہے چپکے سے کھلتا میں برآمدے سے اس کی کوٹھری میں جاتا اور پھر غفورا صدر دروازے میں پڑے ہوئے قفل کی کنجی نکالتا۔ قفل کھلتا اور پھر ہم دونوں کسی نہ کسی ٹاکیز کی طرف چل دیتے۔

ہوم ورک کے ساتھ ساتھ یہ سب دماغ میں گھوم رہا تھا۔

اچانک نورا کسی کام سے میرے برآمدے کے سامنے آیا۔ پھر نہ جانے کیوں میری طرف آکر پیچھے کھڑا ہو گیا۔ پھر پوچھا "کیا پڑھتے ہو سعید میاں؟"

میں جھٹ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ "دوسری کرسی لے آؤں نورا بابا! تم بیٹھ جاؤ تو دکھاؤں اپنی کتابیں اور کاپیاں۔"

"نہیں نہیں سعید میاں! تم پڑھو۔ میں جاتا ہوں۔" نورا اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ میں نو بجے تک اپنا کام کرتا رہا۔ نو بجے ابّا جان اور بھائی جان گھر سے کہیں چلے گئے تو میں امّی جان کے پاس گیا۔

"امّی جان! شوکت صاحب آئے ہیں، پان بنا دیجیے" میرے کہنے پر امّی جان نے کئی اچھے سے پان بنا دیے۔ خاصدان میں رکھے میں خاصدان لیے ہوئے نورا کی کوٹھری میں چلا گیا۔ "نورا بابا! پان کھاؤ گے؟"

نورا کی باچھیں کھل گئیں۔ "کیسے اچھے ہو تم سعید میاں!" کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا دیا لیکن جب خاصدان دیکھا تو جھجکا۔ بڑھا ہوا ہاتھ سمیٹ لیا۔ "یہ تو تم کسی اور صاحب کے لیے لائے ہو سعید میاں؟"

"نہیں تو نورا بابا! آپ ہی کے لیے لایا ہوں۔"

"اور یہ کس نے بنائے ہیں؟"

"امّی جان نے۔"

"اور پھر انہوں نے میرے پاس بھیجا۔"

"جی۔ ای۔ جی ..... ہاں" میں ہکلا گیا۔

"سعید میاں! تم بڑے اچھے بچے ہو لیکن یاد رکھو۔ اچھے بچے جھوٹ نہیں بولا کرتے۔"

نورا نے یہ کہا تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے خاصدان ایک طرف رکھ دیا۔ نورا کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں بنائے بغیر مطلب کی بات چھیڑی۔

"نورا بابا! تم نے سینما دیکھا ہے؟"

"ہاں دو چار بار دیکھا تھا۔ پھر اس سے نفرت ہو گئی۔"

"کیوں، نفرت کیوں ہو گئی۔ مجھے تو بڑا مزہ آتا ہے۔"

"سعید میاں! تم بچے ہو، سمجھتے نہیں بڑی بُری چیز ہے سینما۔"

"نہیں نورا بابا! سینما کے بارے میں یہ بات تم برسوں پہلے کی کہتے ہو۔ اب دیکھو تو خوش ہو جاؤ۔"

"اچھا!؟"

"اور کیا نورا بابا! دیکھو گے؟"

"نہیں بھائی! میرے پاس پیسے کہاں کہ میں سینما دیکھوں۔"

"پیسے میں دوں گا۔ بس تم یہ کروگے کہ عشاء کے بعد جب ابّا جان اور گھر کے دوسرے لوگ سو جائیں تو..... سمجھ گئے نا!

"مگر یہ تو دھوکا دینا ہوا۔ تم ابّا جان سے اجازت کیوں نہیں لے لیتے"

"ان سے ڈر لگتا ہے"

"اور خدا سے نہیں ڈرتے؟"

"ڈرتا تو خدا سے بھی ہوں"

"تو پھر اللہ میاں کو کیا جواب دوگے"

"نورا بابا! اللہ میاں تو قیامت میں پوچھ گچھ کریں گے اور ابّا جان تو آج ہی ٹھونک دیں گے"

نورا میرے اس جواب پر مسکرانے لگا۔ میں نے کہا "تو چلوگے آج؟"

"نہ بابا! میں نہیں جاؤں گا۔ سعید میاں! تم جھوٹ بول رہے ہو کہ سینما اب بڑا اچھا ہو گیا۔ بڑے بڑے لوگ کہتے ہیں کہ سینما تو ہمارے ملک کے لیے لعنت ہے لعنت!"

"اچھا، تم نہ جانا، مجھے جانے دوگے، میں اقبال کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ ابھی جا کر اس سے کہے آتا ہوں کہ عشاء کے بعد تیار رہنا، اور لو نورا بابا!" میں نے پانچ روپیہ کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"سعید میاں! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ اور دیکھو جب یہاں

اکیلے ہوا کرو تو گھر میں رہا کرو۔ اور یہ پانچ روپیہ کا نوٹ جہاں سے لائے ہو، وہیں جا کر رکھو۔ میرا خیال ہے کہ تم نے یہ نوٹ چرایا ہے۔"

"نہیں تو، مجھے امّی جان نے دیا ہے۔"

"اچھا تو میں پوچھتا ہوں امّی جان سے کہ انہوں نے تم کو سینما جانے کی اجازت دے دی ہے۔"

اچھا تم بیٹھو اپنی کوٹھری میں جا کر میں خود دے دوں گا۔

یہ میرا آخری داؤں تھا۔ وہ بھی خالی گیا۔ لیکن اب میں نورا کا دشمن ہو گیا۔ وہ کانٹے کی طرح میری آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔

(۴)

میں نے اپنے دوست اقبال سے مشورہ کیا اور پھر ہر روز نورا کی ایک نہ ایک شکایت ابّا جان اور امّی جان سے کرنے لگا۔

"امّی جان! نورا سودا لانے میں پیسے بچا لیتا ہے اور بیڑی پی جاتا ہے۔ ابّا جان حقّہ پی کر ہٹ جاتے ہیں تو نورا وہی حقّہ مزے لے کر پیتا ہے۔" میں اس طرح کی شکایتیں کرتا لیکن نہ امّی جان پر کوئی اثر ہوتا اور نہ ابّا جان پر۔

ایک دن میں پھر اقبال سے مشورہ لینے گیا تو اُسے بہت

خوش پایا۔ پھر اس نے جو کچھ بتایا اس سے میں خوشی کے مارے اُچھل پڑا۔ اقبال نے بتایا کہ نورا تاڑی پیتا ہے اور یہ بات اُسے اس کے نوکر بدلُو نے بتائی۔ بدلوا رات کو گیارہ بجے تاڑی پینے جاتا ہے۔ اسی نے نورا کو تاڑی خانے میں دیکھا۔

"وہ مارا، لانا پلاؤ والا ہاتھ۔" اقبال بھی بہت خوش تھا اور میں بھی۔ میں خوشی خوشی گھر آیا۔ آتے ہی نورا کی کوٹھری کی طرف مڑ گیا۔ نورا مجھے آتے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ میں نے اس کی کوٹھری میں قدم رکھا اور کہا "تاڑی پیتے ہو۔ بڑے مولوی بنتے ہو۔ ابا جان سے آج ہی کہوں گا۔"

نورا چونک پڑا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے کوٹھری سے جھانک کر صحن کی طرف دیکھا۔ میں اس کی یہ حرکت دیکھتا رہا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اب یہ موٹی چڑیا میرے چنگل میں آگئی ہے اب کہاں جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ نورا تاڑی پینے سے انکار کرے گا تو گواہی میں بدلوا کو بلاؤں گا۔ اور اُسے خوب ذلیل کروں گا یا پھر وہ مجھ سے سینما دیکھنے جانے پر سمجھوتہ کرلے۔ مجھے رات کو نکل جانے دے اور میں ابّا سے نہ کہوں۔ لیکن نورا نے صاف اقرار کر لیا۔ بولا:۔

"پیارے بچے سعید! ہاں میں تاڑی پیتا ہوں لیکن میری یہ

بُری عادت برسوں سے پڑی ہے۔ اگر تم بھی سینما دیکھتے رہے تو تم میں بھی یہ عادت پڑ جائے گی اور پھر جس طرح میں تاڑی پینا نہیں چھوڑ پا رہا ہوں تم سے سینما نہ چھوٹ سکے گا۔ اسی لیے میں تم کو روکتا ہوں۔"

نورا نے اس طرح مجھے سمجھایا لیکن میں نے اُسے گھُڑکا "تو سمجھوتہ نہیں کرتے ؟" نورا چپ ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ دب گیا۔ پھر رات کو عشا کے بعد جب گھر والے سب سو گئے، میں نے جا کر نورا کو بلایا۔ اس سے کنجی مانگی اس نے کنجی دے دی۔ میں نے قفل کھولا اور نکل گیا اور کہہ دیا کہ دو گھنٹے کے بعد آ جاؤں گا۔ جاگتے رہنا۔

(۵)

دوسرے دن صبح ہی صبح ابّا جان نے مجھے بلایا۔ میں گیا تو انہوں نے پوچھا "رات سینما دیکھنے گئے تھے ؟"

"آپ سے کس نے کہا ؟"

"نورا کہہ رہا تھا۔"

"نورا جھوٹا ہے۔ وہ خود تاڑی پیتا ہے۔ یہ بات مجھ کو اقبال نے بتائی۔ اس نے خود مجھ سے اقرار کیا۔ پھر مجھ سے کہتا تھا

کہ ابّا سے نہ کہنا۔ اسی ڈر سے وہ اب مجھے بدنام کر رہا ہے۔"

یہ بات سُن کر ابّا جان کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ نورا کو بڑا اچھا آدمی سمجھ رہے تھے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر نورا کو پکارا۔ وہ آیا تو اباجان نے کہا "تاڑی پیتے ہو اور مجھ سے چھپا کر، اسی طرح تو پہلوان بنے پھرتے ہو۔ میں حیران تھا کہ اس عمر میں یہ موٹا پا کیوں ہے۔ اب پتہ چلا۔ چپ کیوں ہو بتاؤ، تاڑی پیتے ہو یا نہیں؟"

"پیتا تھا مگر اب نہیں پیتا ہوں۔"

"پرسوں تک تم نے پی ہے آج جھوٹ بول رہے ہو!"

"کل توبہ کی ہے میاں!"

ابّا جان خفگی کے باوجود ہنس پڑے۔ مجھے بھی تعجب تھا کہ یہ کیا بات ہے۔ یہ کل توبہ کرنے کی بات کیسی؟ ابّا جان نے اس سے پوچھا "یہ کل کی توبہ کیسی؟

"سرکار،" نورا کہنے لگا "جب سے میں آیا ہوں۔ سعید میاں سینما کے لیے مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ لیکن میں نے ان کی بات نہ مانی۔ میں نے ان کو سمجھایا بھی، ان پر اثر نہیں ہوا۔ پھر جب میرا ایک عیب ان پر ظاہر ہو گیا تو وہ شیر ہو گئے۔ میں نے پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن مجھے ایک بزرگ کی وہ بات یاد آ گئی جو

انھوں نے ایک لڑکے سے گڑ کی عادت چھڑاتے ہوئے کہی تھی۔ وہ بزرگ خود گُڑ کے عادی تھے، پہلے انہوں نے گڑ کھانا چھوڑا تب اس لڑکے کو نصیحت کی تو لڑکے پر اثر ہوا۔ میں نے سوچا کہ میں اپنے عیب سے توبہ کروں تو پھر سعید میاں کو سمجھاؤں۔ اب میں آپ کے سامنے پھر توبہ کرتا ہوں کہ تاڑی نہیں پیوں گا۔ میں نے رات میں تاڑی نہیں پی۔ اب میں آپ کے سامنے سعید میاں کو نصیحت کرتا ہوں کہ جب میں نے برسوں سے پڑی ہوئی عادت کو چھوڑ دیا تو وہ سینما سے باز آئیں۔ ابھی ان میں سینما دیکھنے کی عادت نہیں پڑی ہے۔ اگر عادت پڑ گئی تو پھر وہ کہیں کے نہ رہیں گے اور بالکل ویسے ہی بن جائیں گے جیسے دوسرے نوجوان سینما دیکھ دیکھ کر بنتے جا رہے ہیں۔ بدمعاش اور نالائق۔"

نورا خاموش ہوا۔ تو میں نے ایک لمبی سانس لی۔ ابا جان نے بھی لمبی سانس بھری۔ پھر مجھ سے کہا "کیا کہتے ہو سعید میاں! اب؟"

نہ جانے اس وقت کیا بات تھی۔ میرے اوپر نورا کی توبہ کا بڑا اثر ہوا۔ میں نے بھی عہد کیا کہ اب سینما نہ دیکھوں گا۔

الحمد للہ کہ اس کے بعد پھر میں نے سینما نہیں دیکھا۔

ایک آنے کی واپسی

پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ دن تاریخ تو یاد نہیں۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ صبح کا وقت تھا۔ میں جی بہلانے کو دروازے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک آواز سنائی دی۔ ''دری لے لو۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، ایک نوجوان اپنی پیٹھ پر گٹھڑ لادے میرے گھر کی طرف آرہا تھا۔ میں نے اُسے بلا لیا۔ وہ میرے گھر کے پاس آکر رُکا۔ اس نے اپنی پیٹھ پر سے گٹھر اتارا۔ اسے کھولا۔ پھر کئی دریاں میرے سامنے پھیلا دیں۔ ان میں سے ایک دری مجھے پسند آئی۔ مول بھاؤ ہونے لگا۔ آخر میں نوجوان نے کہا کہ چودہ روپیہ پندرہ آنے سے کم نہ ہوگی۔ اور وہ دریاں تہہ کرنے لگا۔ دری مجھے پسند آگئی تھی۔ میں نے پندرہ روپیہ لاکر اُسے دیدیے۔ نوجوان کے پاس ٹوٹے ہوئے پیسے نہیں تھے۔ اس نے کہا'' بہن تمہارا ایک آنہ میری طرف رہ گیا۔''

میں مسکرادی اور گھر میں چلی گئی، وہ گٹھر باندھ کر " دری لے لو دری"
کی پکار لگاتا ایک طرف کو چلا گیا۔

دری لیے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ نہ مجھے وہ نوجوان یاد رہا اور نہ ایک آنہ باقی کا۔ پھر میں نے ایک دن ایک بڈھے کو دیکھا، وہ میرے گھر کے آس پاس چکّر لگا رہا تھا۔ میں نے پوچھا" بابا! کیا دیکھتے ہو؟ وہ بولا" میرا بیٹا کچھ دن ہوئے یہاں دریاں بیچنے آیا تھا۔ اس نے اسی گھر کا پتہ بتایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس گھر والی کا ایک آنہ پیسہ مجھ پر باقی ہے۔ یہ قرضہ اُسے واپس کرنا ہے، اسی لیے میں آیا ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ بوڑھا آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ میں نے پوچھا۔
" بابا! وہ نوجوان کیوں نہیں آیا؟" بوڑھے نے بتایا " وہ یہاں آنے کے بدلے وہاں چلا گیا جہاں جا کر کوئی کبھی نہیں لوٹتا"۔

" کیا وہ مر گیا بابا!" میں نے جھٹ پوچھا۔ بوڑھا رونے لگا۔ اُس نے روتے ہوئے کہا " اُسے مرے ہوئے مدّت ہو گئی۔ اب میں اس کا قرضہ چکانے آیا ہوں۔ بیٹی! کیا تم ہی ہو، جس نے میرے بیٹے سے دری خریدی تھی؟"

" ہاں بابا!" میری زبان سے نکلا اور میں بھی اُداس ہو گئی
بوڑھے نے ایک آنہ پیسہ مجھے دے دیا اور جانے لگا تو میں نے بار بار

کہہ کر اُسے روکا۔ بوڑھا بڑی مشکل سے رُکا۔ میں نے اُس کے لیے چارپائی بچھادی۔ اُسے دودھ کا شربت پلایا۔ پھر وہ لیٹ گیا۔ وہ سو گیا۔ میں کھانا پکانے لگی۔ جب وہ جاگا تو میرا بڑا لڑکا کھیت سے آچکا تھا۔ میں نے لڑکے کو ساری بات بتائی۔ میرا لڑکا بھی بوڑھے کی خاطر کرنے لگا۔ پھر میں نے بوڑھے کو رات بھر کے لیے روک بھی لیا۔ رات کے وقت مکھیا کو بلایا۔ اس سے سارا حال کہا۔ اب تو گاؤں بھر کے لوگ میرے گھر آ آ کر اس بوڑھے سے مل رہے تھے۔ بوڑھا اپنے بیٹے کا حال سب سے بیان کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ میرا لڑکا بڑا ایماندار تھا۔ وہ خدا سے بہت ہی ڈرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ لین دین میں معاملہ صاف اور کھرا رکھو۔ قیامت کے دن پائی پائی کا حساب ہوگا۔ میرا بیٹا قرضہ سے بھی بہت ڈرتا تھا۔ اس نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ ابا جان! ایک آنہ پیسہ اس گاؤں کی عورت کو دے آنا۔

صبح ہم نے اس بوڑھے کو رخصت کیا۔ بوڑھا روتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے میرا بڑا لڑکا اُسے بھیجنے جا رہا تھا اور میرے بیٹے کے سر پر ایک گٹھر تھا اس گٹھر میں گاؤں والوں کے وہ تحفے تھے جو انہوں نے بوڑھے کو رخصت کرتے وقت دیے تھے۔ یہ تحفے بوڑھا لے نہیں رہا تھا۔ ہم نے زبردستی اس کے ساتھ کر دیے تھے۔

پھر میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ میں بھی زندگی بھر خدا سے ڈرتی رہوں گی اور معاملہ صاف اور کھرا رکھوں گی۔

آج اس بات کو پندرہ برس سے زیادہ ہو گئے۔ میں نے جو کچھ دل میں طے کر لیا تھا اس پر اب تک اٹل ہوں۔